قرآن شناسی

غدیر و نوروز

قرآن کی آخری آیت اور اکمال دین و اتمام نعمت

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی صاحب قبلہ طاب ثراہ

(حضرت سید العلماء کے موعظہ ۲۲/ذیقعدہ ۱۳۵۱ھ روز یکشنبہ کا مختصر اقتباس) قرآن مجید کے متعلق جہاں تک مفسرین وعلمائے اسلام کے متفقہ بیانات پر نظر ڈالی جاتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب شان نزول کے مطابق نہیں ہوئی ہے بلکہ اس میں اول کا آخر اور آخر کا اول ہو گیا ہے اور اسی اختلاف ترتیب کا نتیجہ تھا کہ موجودہ صورت میں اس کی ابتداء اور انتہا بھی محفوظ نہیں رہی ہے۔

ابتداء قرآن مجید کی یعنی سب سے پہلا سورہ کہ جو جناب رسالت مآبؐ پر نازل ہوا تھا وہ سورۂ اقراء ہے اور سب سے آخری سورہ جو نازل ہوا ہے وہ سورۂ مائدہ ہے اور اس میں بھی سب سے آخری آیت: اَلْیَومَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے سورۂ توبہ کو آخری سورہ قرار دیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ سورۂ توبہ ۹ ہجری میں نازل ہوا ہے جب کہ رسالتمآبؐ نے حج نہیں کیا تھا بلکہ امیر المومنینؑ کو حکم امتناعی کے ساتھ مکۂ معظّمہ روانہ کیا تھا کہ آئندہ سے مشرکین آکر خانہ کعبہ کا برہنہ طواف نہ کریں اس کے بعد رسولؐ سال بھر زندہ رہے اور آخر ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے فرض کو انجام دیا اور سورۂ مائدہ اسی حجۃ الوداع میں نازل ہوا ہے۔ تو پھر سورۂ توبہ آخری سورہ کہاں قرار پا سکتا ہے؟

ہرگز نہیں بلکہ حقیقت یہی ہے کہ آخری سورہ مائدہ ہے اور اس میں آخری آیت اَلْیَومَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ہے جو ۱۸/ذی الحجہ کو نازل ہوئی اس وقت کہ جب رسالت مآبؐ نے مقام غدیر خم میں علی بن ابی طالبؑ کی وصایت کا اعلان کیا اور اگر غور کیا جائے تو آیت خود بھی اپنے آخری ہونے کا اظہار کر رہی ہے۔

اصول فصاحت وبلاغت کے رو سے جس طرح ابتدائے کلام میں ایسا تذکرہ ہوتا ہے جو اصل مقصد کو بتلاتے ہوئے افتتاح پر دلالت کرے اسی طرح اختتام میں ایسے الفاظ ہوتے ہیں جو اختتام کو ظاہر کریں۔

قرآن مجید کی ابتدا ہوئی اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ''پڑھو خدا کا نام لے کر۔''

اس سے اشارہ ہوا کہ اب قرآن کا افتتاح ہوتا ہے اور اس لئے مخاطب کو قرأت پر آمادہ کرتے ہوئے خدا کا نام لینے کی ہدایت ہوئی جو ابتداء کی خصوصیت ہوا کرتی ہے۔

انتہا اَلْیَومَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ اس میں اَکْمَلْتُ اور اَتْمَمْتُ کی دونوں

لفظوں سے تمام وکمال کا پتہ دیا گیا اور یہ کہ اب جو کچھ پہنچنا تھا پہنچ چکا اور جو کچھ شریعت کی تکمیل ہونا تھی ہو چکی، رسولؐ کی زندگی میں بھی اس لئے کہ قرآن مجید پورا اُتر چکا اور رسولؐ کے بعد کی بھی اس لئے کہ بعد کا انتظام علیؑ کی وصایت کے اعلان سے کرا دیا گیا۔ اس طرح اکمال دین اور اتمام نعمت ہوا اور اس طرح اسلام دین مرضی الٰہی قرار پایا۔ یہ تھا وہ مبارک دن جس کی عظمت کا احساس اسلام والوں کے علاوہ غیروں کو تھا چنانچہ تفسیر درمنثور حافظ جلال الدین سیوطی میں ہے: عَنْ اَبِیْ الْعَالِیَۃِ قَالَ کَانُوْا عِنْدَ عُمَرَ فَذَکَرُوْا ھٰذِہِ الاٰیَۃَ فَقَالَ رَجُلٌ مِنْ أَھْلِ الْکِتَابِ لَوْ عَلِمْنَا أیَّ یَوْمَ نَزَلَتْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃُ لَا تَّخَذْنَاہُ عِیْداً فَقَالَ عُمَرُ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَہٗ لَنَا عِیْداً۔

حضرت عمر کے سامنے اس آیت کا تذکرہ ہوا، ایک شخص نے اہل کتاب (یہود) میں سے کہا اگر ہم کو معلوم ہوتا یہ آیت کس دن نازل ہوئی ہے تو ہم تو اس کو عید قرار دیتے۔ حضرت عمر نے کہا شکر ہے خدا کا کہ اس نے اس دن کو ہمارے لئے عید قرار دیا ہے، جتنے واقعات مختلف ایام میں ہوتے ہیں ان کے لئے دو حیثیتیں پائی جاتی ہیں ایک حرکت قمر کے اعتبار سے اور اس کے تغیر وتبدل کی حیثیت سے جو مہینہ کے مختلف اوقات میں ہوتا رہتا ہے اور ایک آفتاب کی حرکت سے کہ جس کا دورہ سال بھر میں ختم ہوتا ہے اور جس کے ذریعہ سے اوقات وفصول میں تغیر وتبدل ہوتا ہے۔

شریعت اسلام کے احکام میں جہاں تک نظر کی جاتی ہے ان کی بنیاد زیادہ تر قمری حساب پر قرار دی گئی ہے اس لئے کہ اس کا انضباط ذاتی مشاہدہ واحساس پر مبنی ہے جس میں خواص وعوام مساوی درجہ رکھتے ہیں اور اس طرح ہر شخص اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر اپنے اعمال کو صحیح طور پر بجا لاسکتا ہے برخلاف آفتاب کی حرکت اور اس کے منازل کے، وہ سوائے منجمین اور علماء افلاک کے کسی کے سمجھنے کی چیزیں نہیں ہیں اور اس لئے عام افراد کے لئے ان پر عمل آسان نہیں ہے۔

لیکن یہ اس اہم واقعہ وصایت امیرالمومنینؑ کی خصوصیت تھی کہ اس میں قمری وشمسی دونوں حسابوں کو معتبر قرار دیا گیا، قمری حساب سے تاریخ ۱۸؍ذی الحجہ قرار پائی جس کا نام عید غدیر ہوا اور شمسی حساب سے چونکہ اس تاریخ جب یہ اہم واقعہ رونما ہوا آفتاب نقطۂ اعتدال پر پہنچا تھا جو برج حمل میں اس کے داخلہ کا مرادف ہے اس لئے سال کی تاریخوں میں یہی دن کہ جب آفتاب برج حمل میں داخل ہوا اور اعتدال کا وقت آئے عید قرار پایا جس کا نام نوروز ہے اور پھر اتفاق سے امیرالمومنینؑ کی خلافت ظاہری بھی اسی دن تھی جس کے معنی یہ ہیں کہ آفتاب خلافت اپنے نقطۂ اعتدال پر آیا تھا جس کے اندر افراط وتفریط کا شائبہ نہیں لاشرقیۃ ولاغربیۃ بلکہ جوامۃً وسطاً کا صحیح مصداق ہے۔ اس لئے یہی رمز کے طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دن کو یادگار قرار دے دیا گیا اور آفتاب خلافت کے نقطۂ اعتدال پر پہنچنے کی یاد دہانی میں ہر سال جب آفتاب نقطۂ اعتدال پر پہنچے اس کو مسلمانوں کے لئے عید مقرر کر دیا گیا۔

آفتاب خلافت کا نقطۂ اعتدال

خلافت یا جانشینی رسولؐ کو اس کے حقیقی مفہوم کے

اعتبار سے دیکھوتو وہ کبھی امیرالمومنینؑ سے جدا نہ تھی اور نہ ہوسکتی تھی، وہ ایسی شےنہیں جو چھینی جاسکے یا زبردستی اس پر قبضۂ مخالفانہ قائم کیا جائے، مال ودولت صندوقوں میں بند کرکے مضبوط ومستحکم مکانات میں مقفل کرکے رکھا جائے اوراس کی حفاظت کے لئے پہرے بٹھائے جائیں لیکن کسی متبحّر عالم کاعلم، جنگ آزما شجاع کی شجاعت، دریادل سخی کی سخاوت کبھی اس کی محتاج نہیں ہوئی کہ اس کو پردوں میں چھپاکر اورصندوقوں میں مقفل کرکے محفوظ کیا جائے یا اس کے متعلق چوراورڈاکوؤں کی دست بردکا اندیشہ ہو۔

حقیقۃً خلافت کے معنی یہ ہیں کہ رسولؐ کی وفات کے بعد ایک شخص ان کی جگہ کو پر کردے، بایں معنی کہ اخلاق وکمالات میں اس طرح رسولؐ کی تصویر ہوکہ گویا دنیا کومعلوم نہ ہورسولؐ دنیا سے اُٹھ گئے ہیں،شریعت کومعلوم نہ ہوکہ مبلغ شریعت موجودنہیں ہے،اسلام کومعلوم نہ ہوکہ اس کا مؤسس عالم میں نہیں رہا،قرآن کومعلوم نہ ہوکہ اس کا حامل رخصت ہوگیا،سنت کومعلوم نہ ہوکہ اس کا پہنچانے والاباقی نہ رہا،مختصر یہ کہ فریضۂ اصلاح ونظام عالم میں جن چیزوں کو دخل ہے اس کی حیثیت سے وہ اپنے پیش رو نبی کا اس حد تک سہیم وشریک ہوکہ تبلیغ احکام اور حفظ شریعت میں کسی طرح نقص وفتور نہ ہونے پائے، اگرچہ ذاتی وشخصی کمالات کے اعتبار سے دونوں ہستیوں میں اتنا تفاوت ضروری ہوگا جتنا خود منصب نبوت وخلافت میں تفرقہ موجود ہے۔

مذکورہ بالا حقیقت کو دیکھتے ہوئے خلافت کسی مقرر کئے ہوئے وظیفہ یا عطا کئے ہوئے منصب کا نام نہیں ہے بلکہ ان شخصی اور ذاتی کمالات کا نام ہے جو خالق کی طرف سے کسی مخصوص بندہ میں ودیعت کردیئے گئے ہیں اور جو مبداءِ خلق وتکوین میں اس کی ذات سے مخصوص ہوگئے ہیں، وہ نہ کسی کے علٰیحدہ کرنے سے علٰیحدہ ہوسکتے ہیں، نہ کسی کے چھیننے سے چھن سکتے ہیں۔

اس مفہوم کے اعتبار سے اگر امیرالمومنینؑ کی شخصیت پرنظرڈالی جاتی ہےتو وہ اپنی زندگی کے ہردور،اپنی عمرکی ہر ساعت، ہر دقیقہ، ہر ثانیہ میں رسولؐ کے خلفیہ وجانشین نظر آتے ہیں،کس کو یہ طاقت حاصل ہے کہ وہ اس خلافت کوعلی بن ابی طالبؑ سے علٰیحدہ کرسکے۔

یقیناسخت غلطی ہے اگرمیں علی بن ابی طالبؑ کی اس خلافت کے متعلق کسی تاریخ یا دن کا تعین کروں،نوروز ہو، یاغدیر، یا بیعت العشیرہ کی محفل ہو یا اِنَّمَا وَلِیُکُمُ اللّٰہُ کا موقع،ان میں سے کوئی بھی علیؑ کی جانشینی کی تاریخ نہیں ہے بلکہ درحقیقت یہ سب وہ اشتہارات واعلان ہیں کہ جو عالم افرادکی اطلاع کے لئے شائع کئے گئے ہیں،

چونکہ خلافت باطنی رمز اورمخفی حقیقت ہے جس کی تشخیص معمولی افراد بشر کا کام نہیں ہے بلکہ وہی ہستی کہ جو نوع بشر کے آب وگل کی خلق کرنے والی تھی اس رمز وحقیقت پرمطلع ہوسکتی ہےاس لئے ایسے شخص کی تعیین کرنا بھی اسی علام الغیوب ہستی کا کام ہے اوراسی لئے اس نے رسولؐ کی معرفت عالم بشری تک اپنے نتیجہ انتخاب کی اطلاع پہنچائی اورمتعددطریقوں سے عنوان بدل بدل کراس کی تبلیغ کرائی، مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہ فھذا علی مولاہ، اِنَّمَا وَلِیُکُمُ اللّٰہُ

وَرَسُوْلُہٗ ھٰذَا وَصِیِّیْ وَخَلِیْفَتِیْ۔ عَلِیٌّ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ ھٰرُوْنَ مِنْ مُوْسٰی وغیرہ وغیرہ آیات واخبار کے ذریعہ سے علی ابن ابی طالبؑ کی خلافت کو امت اسلامیہ تک پہنچایا گیا ہے۔

بیشک جس طرح رسولؐ اپنی زندگی میں مسلمانوں کے روحانی بادشاہ ہیں اوران کا تمام نظم ونسق، سیاہ سفید حضرت کی حکم کا تابع ہے (اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُوْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ) اسی طرح ان کا جانشین اورخلیفہ کہ جوان کے مراتب کمال کا حامل اور فرائض دینیہ کا حافظ ہے خدا کی جانب سے اس بات کا مستحق ہے کہ امت کی زمام حکومت اس کے ہاتھ میں ہو اور وہ اپنی مرضی کے مطابق ان کے انتظامی اور تمدنی فلاح ونجاح کا سامان بہم پہنچائے، یہ وہ ظاہری آثار ہیں جو خلافت الٰہیہ کے ساتھ خلیفہ وامام کے لئے ثابت ہوتے ہیں اور چونکہ ان کا تعلق ظاہری شان وشوکت اور حکومت وسلطنت سے ہے اس لئے مختلف افراد کی طمع وحرص اور ظلم وتعدی کا مرکز بن سکتے ہیں اور ظاہری نظریں اسی کو واقعی خلافت اور جانشینی خیال کرتے ہوئے یہ کہنا جائز سمجھتی ہیں کہ امیر المومنینؑ سے خلافت علٰیحدہ کر لی گئی یا غیر مستحق افراد نے اس پر قبضہ کرلیا اور ہمارے اس مضمون میں بھی آیندہ جب خلافت کی لفظ نظر آئے تو اس سے انہی معنی کو مراد سمجھنا چاہئے۔

رسالتمآبؐ کی وفات کے بعد جو انقلاب ہوئے اور ان میں حقائق اور واقعات کا جس طرح خون کیا گیا اس کا تذکرہ مقصود نہیں، تاریخ اُن تمام واقعات کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے، خلافت نے اپنے حقیقی مرکز سے ہٹ کر کتنے بھیس بدلے اور کیسی مختلف صورتیں اختیار کیں؟ وہ تمام ان سیاسی داؤں پیچوں کا نام ہوگیا جن کے ذریعہ سے مسلمانوں کی جماعت کو بھیڑوں کی طرح اپنے مقصد کے موافق ہنکایا جاسکے۔

ہر شے کی ایک میعاد ہوتی ہے، ناانصافی، خودغرضی، اپنوں کی جانبداری حقداروں کے حقوق سے چشم پوشی، ستم رسیدہ مظلوموں کے فریادوشیون سے چشم پوشی انتہا تک پہنچ چکی تھی، مسلمانوں کے صبر وضبط کا پیمانہ چھلکا اور اس نے خلیفۂ وقت کے سفینۂ حیات کو غرق کر کے چھوڑا۔

یہ اقدام کتنے بھی حق بجانب شکایات کا نتیجہ ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ نامناسب تھا، امیر المومنینؑ کا تیس برس تک خون جگر پیتے رہنا اور صبر کرنا اسی لئے تو تھا کہ تلوار کھینچنا اسلام کے مجتمع شیرازہ کے منتشر ہونے کا باعث اور مسلمانوں کی خوں ریزی کا سبب ہے ورنہ وہی تلوار کہ جس نے جوانی میں مرحب وابن عبدود کا خون بہایا اور بدر واحد وخیبر وخندق کو فتح کیا اور بڑھاپے میں جمل وصفین ونہروان کے میدانوں میں اپنے جوہر دکھا کر دشمنوں کے دلوں پر سکہ قائم کیا وہی ادھیڑپن میں بھی علیؑ ابن ابی طالب کے پاس موجود تھی، نہ اس کی باڑھ کند ہوئی اور نہ امیر المومنینؑ کے بازوؤں کی سکت میں کمی ہوئی تھی پھر اتنی طویل مدت تک مختلف قسم کے ظلم وایذا بلکہ توہین وتذلیل کا برداشت کرنا اسی لئے تو تھا کہ اسلام کی بندھی ہوئی مٹھی کھلنے نہ پائے، اسی وجہ سے آخری دور میں جن افراد نے خلیفۂ وقت کے قتل کا اقدام کیا ان کو بھی امیر المومنینؑ کی طرف سے کوئی مدد نہیں دی گئی بلکہ متعدد مرتبہ

درمیان میں پڑ کر فتنہ کی آگ کو خاموش کیا اور غصہ میں بھرے ہوئے حملہ آوروں کو سمجھا بجھا کر ہٹا دیا لیکن افسوس ہے کہ واقعات نازک سے نازک تر صورت اختیار کرتے گئے اور آخر قصر حکومت کی زمین فرمانروائے خلافت کے خون سے رنگی ہوئی نظر آئی، اب ذرا مسلمانوں کی آنکھیں کھل چکی تھیں، تاریکی سے دم اکتا گیا تھا روشنی کی تلاش تھی، اس کے لئے ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں تھی، غدیر کے عمومی اعلان کی آواز ایسی نہ تھی جو ایک مرتبہ فضا میں گونج کر فنا ہو جائے، یہ تو کہو کہ اب تک اغراض نفسانیہ، تعصب وعداوت، تخویف وتہدید اور جبر وظلم لوگوں کی آنکھوں پر پردہ ڈال کر ان کے ضمیر کے خلاف ڈھکیل رہے تھے لیکن اگر ان کے باطنی جذبات اور نفسانی کیفیات کا جائزہ لیا جاتا تو صاف معلوم ہو جاتا کہ وہ خود اپنے نزدیک گنا ہگار تھے، یقیناً ان کی آنکھوں کے سامنے غدیر کے میدان کا مرقع ہر وقت پھرتا اور کانوں میں وہ پرزور آواز گونجتی ہوگی، اب تو موانع برطرف ہو چکے تھے، سچ مچ حق کی تلاش تھی اور خلافت کو اس کے حقیقی مرکز تک پہنچانا تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ظاہر کو باطن سے، لفظ کو معنی سے مطابق کرنا منظور تھا، آئے اور سیدھے اسی مرکز پر آئے جہاں پہلے آنا چاہئے تھا علی بن ابی طالبؑ کے دروازہ پر مہاجرین وانصار کا ہجوم ہو گیا اور ہر شخص کی یہی خواہش کہ اب آپ اپنی حقیقی جگہ پر تشریف لائیں اور حفظ شریعت اور ہدایت خلق کا فریضہ جو اب تک پردے میں رہ کر ادا کر رہے تھے اب مسند خلافت پر متمکن ہو کر ظاہری صورت میں ادا فرمائیں، تاریخی واقعات میں جو شخص جوڑ پیوند لگانا چاہتا ہو اور غیر متفرق باتوں کو ایک سلک میں مسلسل دیکھنے کا عادی ہو اس کو اس موقع پر حیرت واستعجاب کی انتہا نہیں رہتی کہ امیر المومنینؑ ایک وقت میں خود سے خلافت کے طالب تھے، ایک ایک کے دروازہ پر جا جا کر ہمدردی ونصرت حاصل کرنا چاہتے اور عام طور سے اپنے حق کا اعلان کرتے تھے جس کی وجہ سے نہ معلوم کتنی مصیبتوں اور سختیوں کو بھی برداشت کرنا پڑا آج وہی امیر المومنین ہیں کہ مہاجرین وانصار چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، الحاح واصرار کی انتہا نہیں لیکن علی بن ابی طالبؑ کسی طرح خلافت کو منظور نہیں کرتے اور انکار ہی کر رہے ہیں بات یہ ہے کہ وہ وقت جب امیر المومنینؑ اپنے حق کی رو سے خلافت کے طالب تھے وہ تھا کہ جب تازہ تازہ رسولؐ کی آنکھ بند ہوئی تھی حضرت کے روحانی تعلیمات کا اثر مسلمانوں کے دلوں سے پرورنہ ہوا تھا، علی ابن ابی طالبؑ کی سیرت اور ان کا طرز عمل بھی بالکل وہی تھا کہ جو ان کے استاد اور مربی رسالت مآبؐ کا اسوۂ حسنہ تھا، یقیناً اگر اس وقت مسند خلافت پر علی ابن ابی طالبؑ متمکن ہو جاتے تو دنیا کو معلوم بھی نہ ہوتا رسولؐ کب دنیا سے اُٹھے؟ وہی انصاف وعدالت وہی تبلیغ احکام اور حفظ شریعت، وہی رحم وکرم اور رواداری، وہی قواعد وقوانین اسلام کی پابندی ومحافظت، مسلمان تو اسی طریق حکومت کے عادی تھے ہی، یقیناً عالم گہوارۂ امن وامان ہوتا اور حقیقی اسلام منتہائے ترقی کے ساتھ عالم میں منتشر ہوتا مگر اس وقت علیؑ کی شنوائی نہ ہوئی، تاہم خلافت کے دو دوروں تک نظام حکومت میں جتنی کمزوریاں بھی ہوں لیکن اموال

مسلمین اورحقوق عامۂ ناس میں کوئی کھلی ہوئی فروگذاشت نہ ہوتی تھی اور ظاہری صورت میں ایک حد تک مساوات کا خیال رکھا جاتا تھا، اسی وجہ سے تیسرے خلیفہ کے انتخاب کے موقع پر بھی امیرالمومنینؑ نے پوری قوت کے ساتھ اپنے حق خلافت کا اعلان کیا اور ادلّہ وبراہین کے ذریعہ سے اپنے استحقاق کو ثابت کر دیا لیکن جب کہ لوگوں نے خلافت کو امیرالمومنینؑ کے سامنے پیش کیا اور حضرت سے اصرار کیا تو یہ وہ وقت تھا کہ مسلمانوں کی عادتیں خراب ہوچکی تھیں، مسلمانوں کے حقوق میں عدم مساوات، جانبداری اور بیجا رعایت، اموال مسلمین میں پوری فیاضی کے ساتھ تصرف کا دور دورہ تھا، اسلامی مساوات واخوت اور اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ کی حقیقت بالکل لوگوں کو فراموش ہوچکی تھی اور کسی کو اس کا احساس نہ تھا تمام مناصب اور بڑے عہدے بنی امیہ کے قبضہ میں تھے، اموال مسلمین کے وہ بلاشرکت غیر مالک بنادیئے گئے تھے اور جو لوگ زیادہ حاضر دربار رہتے تھے اور بارگاہ معلیٰ میں تقرب حاصل کر لیتے تھے ان کو تمام مسلمانوں سے زیادہ بیت المال کے خزانہ کا استحقاق ہوتا تھا، بڑے بڑے اسلامی بلاد بنی امیہ کے زیرنگین کئے جاچکے تھے، ان تمام واقعات نے حقیقۃً خلافت کو اس قابل نہیں رکھا تھا کہ امیرالمومنینؑ اس کو اپنے ہاتھ میں لیں، حضرت ان حالات اور تغیرات کو پورے طور پر سمجھے ہوئے تھے جو اسلامی مزاج میں رونما ہوگئے تھے، وہ خوب جانتے تھے کہ میں اگر اس وقت خلافت کو منظور کروں گا تو کبھی کامیابی کے ساتھ شریعت الٰہیہ اور احکام اسلامیہ کے راستہ پر اس کو نہیں چلا سکتا، اسی وجہ سے مہاجرین وانصار کے حد سے زائد اصرار پر آپ ہی فرماتے رہے کہ **اکون وزیر اخیر لکم من ان اکون امیر**، تمہارے لئے میں امیر ہوں، اس سے بہتر یہ ہے کہ امیر کوئی اور ہو میں اس کا وزیر ہوں اس لئے کہ وزیر کا فرض مشورہ دینا ہے لیکن ذمہ دار وہ شخص ہے کہ جو تخت امارت پر متمکن ہے آخر میں امیرالمومنینؑ کو منظور کرنا پڑا اور اس کا باعث صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ مہاجرین اور انصار کے منتہائے اصرار اور اس اعلان کے بعد کہ ہم آپ کی امتثال اور اطاعت پر آمادہ ہیں ان کی خواہش کو رد کرنا گویا ان کی طرف سے اتمام حجت کا باعث تھا اور ان ذمہ داریوں کو دیکھتے ہوئے جو ایک حقیقی رہنمائے خلق کے متعلق خداوندعالم کی طرف سے مقرر ہیں اگر حضرت اس موقع کو ہاتھ سے جانے دیتے تو خدا کی بارگاہ میں جواب دہ ہونا پڑتا۔

امیرالمومنینؑ کی خلافت ایک عیسائی کی نظر میں

عبدالمسیح انطا کی ملک عرب کے مشہور مؤلفین ومصنفین میں سے تھا اور مصر کے ارباب قلم میں خاص مرتبہ رکھتا تھا، ایک عرصہ تک جریدۃ العمران کے ذریعہ عربی تاریخ ادب کی خدمت کی اور تقریباً ۱۹۲۱ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس کو اسلامی واقعات سے خاص دلچسپی تھی اور کئی سال تک ممالک اسلامیہ کا دورہ کرکے اسلامی معلومات کو حاصل کیا تھا جس کا بہترین نتیجہ قصیدۂ علویہ ہے جو درحقیقت اس کی عمر کا عظیم ترین کارنامہ کہے جانے کا مستحق ہے، ہم نے دوسال قبل اخبار سرفراز کے رجب نمبر میں اس قصیدہ کے خصوصیات پر کافی روشنی ڈالی ہے لیکن چونکہ اس کو عرصہ

گذر گیا اور یقینا وہ خصوصیات اکثر ناظرین کو محفوظ نہ ہوں گے لہٰذا اس موقع پر اتنے حصہ کا نقل کرنا ضروری ہے۔

''قصیدۂ علویہ عبدالمسیح انطا کی کے ان زرین کارناموں میں سے ہے جن پر دنیائے تصنیف ایک مدت تک فخر کرنے کا حق رکھتی ہے، امیر المومنینؑ کی مفصل ومبسوط سیرت، حقائق اسلام پر تبصرہ، حکومت وخلافت پر غیر جانبدارانہ خیالات کا اظہار، بعثت رسولؐ کے قبل عرب کے اخلاق وعادات رسالت مآبؐ کی سچی تعلیم کے تاثیرات، اسلامی تاریخ کے اہم نکات پر منصفانہ بحث، ان تمام مطالب کو ۶۰۰ رصفحہ کی کتاب میں اس عنوان کے ساتھ جمع کیا گیا ہے جس کی نظیر اس کے قبل ملنا دشوار ہے، یقینا امیر المومنینؑ کی سیرت میں کسی مسلمان نے ابھی تک اس گرانقدر فرض کو اس طرح ادا نہیں کیا تھا جس طرح ایک عیسائی نے اس فرض کو ادا کیا ہے، اس پر طرّہ یہ ہے کہ ادبی حیثیت سے اس کو علمی سائنس کا حیرت انگیز کرشمہ کہنا چاہئے، اتنی مبسوط کتاب جس میں تمام واقعات وحقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے ایک قصیدہ کے ضمن میں اس طرح نظم کرنا کہ شروع سے آخر تک ایک ہی ردیف وقافیہ باقی رہے یقینا ادبی دنیا میں پہلا نمونہ ہے۔ یہ قصیدہ پانچ ہزار پانچ سو پچانوے (۵۵۹۵) اشعار پر مشتمل ہے جن میں تکلف وتصنع کا لگاؤ نہیں اور خالص عربی زبان کا لطف بھی موجود ہے۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۱۹ء تک دو برس کے عرصہ میں اس کی تصنیف ہوئی ہے اور ۱۹۲۰ء میں مطبع رعمیس (فجالہ) مصر سے طبع ہوکر شائع ہوا ہے۔'' (سرفراز لکھنؤ جلد ۴، نمبر ۲۸) غالباً اس بیان سے قصیدہ علویہ کے خصوصیات واضح ہوگئے ہوں گے، اسی قصیدہ میں فاضل مؤلف نے امیر المومنینؑ کی خلافت اور مہاجرین وانصار کے خیالات کی جن لفظوں میں تصویر کھینچی ہے ان کو اس مقام پر نقل کرنا چاہتا ہوں، میں نہیں سمجھ سکتا کہ اردو ترجمہ میں وہ لطف کہاں سے پیدا کروں کہ تمام ناظرین اصل اشعار کے ممتاز خصوصیات کا اندازہ کرسکیں۔

مَا مَاتَ عُثْمَانُ اِلَّا وَالصِّيَاحُ دَوَىٰ

بَيْنَ الْاَعَارِبِ اَعْطُوْا الْقَوْسَ بَارِيْهَا

عثمان کا مرنا تھا کہ ملک میں شور برپا ہوگیا، اب کمان اسی کی بنانے والے کے ہاتھ میں دو (یعنی خلافت اس کے اصلی حقدار تک پہنچاؤ)

اِنَّا نَرُوْمُ اِمَاماً عَالِماً فَقِهاً

وَعىٰ الشَّرِيْعَةَ وَاسْتَقْصٰى مَعَانِيْهَا

ہم ایسا امام چاہتے ہیں جو علم وفقاہت کے ساتھ احکام شریعت کا حافظ اور اس کے معانی کا احاطہ کئے ہو۔

وَحَاكِماً عَادِلاً لِلْحَقِّ مُنْتَصِراً

بِهٖ تَنَالُ رِعَايَاهُ نَسَاوِيْهَا

وہ ایسا عادل حاکم ہو جو ہمیشہ حق کا طرفدار رہے اور جس کے دور میں رعایا کے اندر مساوات کا درجہ حاصل رہے۔

وَسَيِّداً مَا تَعَالىٰ عَنْ رَعِيَّتِهٖ

فَاِنْ اَتَتْهُ تُفَاهِيْهِ يُفَاهِيْهَا

ایسا سید وسردار کہ جو کبھی اپنے تئیں رعیت سے بلند نہ سمجھے اگر رعیت اس سے آکر منھ درمنھ بات کرنا چاہے تو وہ کشادہ پیشانی کے ساتھ باتیں کرنے پر آمادہ ہو۔

وَاُمِراً اِشْتِرَاکِیّاً کَمَا نَزَلَتْ

آیُ الھُدٰی وَکَمَا قَدْ شَاءَ مُوْحِیْھَا

اور وہ اشترا کی رہنما کہ جو آیات قرآن اور ان کے اُتارنے والے کے منشاء کے مطابق حکم کرتا ہو۔

نَخْتَارُ مَنْ لَا یُحَابِیْ بَیْنَ اُمَّتِہٖ

اِذَا تَنَازَعَ سَفْلُھَا وَعَلُوِیْھَا

ہم اس کو پسند کرتے ہیں جو بڑے اور چھوٹے شخص کے مقابلہ کے وقت جانبداری اور رورعایت کو صرف نہ کرے۔

نَخْتَارُ مَنْ لَا یَرٰی تَمْیِیْزَ عِتْرَتِہٖ

عَنْ رَعِیَّہٖ اَوْ یَوْمًا یُحَابِیْھَا

ہم اس کو پسند کرتے ہیں جو عام رعیت پر اپنی اولاد تک کو مقدم نہ سمجھتا ہو اور ان کے ساتھ کسی قسم کی ناحق مراعات کو جائز نہ سمجھے۔

نَخْتَارُ مَنْ تَعْرِفُ الْھَیْجَاءُ کَرَّتَہٗ

وَمَنْ یَصُوْلُ عَلَی الْاَعْدَا وَیَنْکِیْھَا

ہم اس کو پسند کرتے ہیں جس کے تابڑتوڑ حملوں کو میدان جنگ پہچانے ہوئے ہے اور جو دشمنوں پر حملہ کر کے ان کے دلوں کو برما دیتا ہو۔

نَخْتَارُ مَنْ یَزْدَرِیْ الْاَمْوَالَ یَحْقِرُھَا

زُھْداً وَیَبْذُ لُھَا بِرًّا لِمَا فِیْھَا

ہم اس کو پسند کرتے ہیں جو مال دنیا کو بے حقیقت سمجھتا ہو اور اس کو دریا دلی سے فقرا و مساکین پر صرف کرے۔

نَخْتَارُ مَنْ کَانَ لِلْھَادِیِ الرَّسُوْلِ أَخاً

تِلْکَ الْأُخُوَّۃُ اَخْلَقُ اَنْ نُرَاعِیْھَا

ہم اس کو پسند کرتے ہیں جو رہنمائے اسلام رسولؐ کا بھائی ہے اور اس اخوت کا لحاظ ہم کو سب سے زیادہ ضروری ہے۔

خِرْنَا الَّذِیْ رَبُّہٗ قَدْ خَارَہٗ وَرَسُوْ

لَہٗ وَخِیَرَتُہٗ ھَبُّوْا لِنُمْضِیْھَا

ہم نے اسی کو پسند کیا ہے جس کو خدا اور اس کے رسولؐ نے منتخب کیا ہے اور اسی کے انتخاب کو آؤ ہم بھی امضا کریں۔

کَذَاکَ کَانَتْ جُمُوْعُ الْمُسْلِمِیْنَ بِنَا

دِیْ بَعْضُھَا الْبَعْضَ مَا اَحْلٰی تُنَادِیْھَا

یہی باتیں تھیں جو مسلمانوں کی جمعیت میں ایک دوسرے کو پکار پکار کر ہو رہی تھیں اور حقیقۃً کتنی شیریں باتیں تھیں۔

وَبَاتَھَا لَیْلَ اَمَّتْ دَارَ حَیْدَرَۃٍ

بِمَا لَدَیْھَا مِنَ الْآمَالِ تُزْجِیْھَا

سب کے سب تکبیر و تہلیل کی آوازوں کے ساتھ علی بن ابی طالبؑ کے گھر کی طرف چلے اور امیدیں اُن کے قدموں کو بڑھا رہی تھیں۔

وَزُمْرَۃٌ مِنْ وُجُوْہِ الْقَوْمِ قَدْ دَخَلَتْ

عَلَی الْعَلِیِّ وَحَیَّاہُ مُحَیِّیْھَا

اور ایک ممتاز جماعت باوجاہت اشخاص کی اس بلند مرتبہ امام کی خدمت میں آئی، اور آداب تسلیم کو ادا کیا۔

فِیْھَا زُبَیْرٌ وَفِیْھَا طَلْحَۃُ وَسِوٰی

لِھٰذَیْنِ مِمَّنْ سَمُوْا فِیْ الْعَرَبِ تَوْجِیْھَا

ان میں طلحہ و زبیر اور ان کے علاوہ ملک عرب کے بہت سے موجہ اشخاص تھے۔

قَالَتْ مِمَّا لَكُنَا ذَاالْيَوْمِ شَاغِرَةً
وَاَنْتَ صِهْرُ نَبِيِّ اللهِ تَحْمِيهَا

عرض کیا کہ ہمارا ملک پُرآشوب ہوگیا ہے اور آپ ہی اے رسولؐ کے داماد اب اس کی حفاظت کر سکتے ہیں۔

بَادِرْ لِنَجْدَتِنَا وَاقْبَلْ اِمَارَتَنَا
فَضْلاً وَاِنَّا اِلٰى عَلْيَاكَ نُهْدِيهَا

ذرا بڑھ کر ہماری دادرسی کیجئے اور احسان کر کے امارت کو قبول فرمالیجئے اور ہم اسے آپ ہی کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

نَادَ اهُمْ يَمَمُوْا غَيْرَ فَاِنِّيْ قَدْ
زَهِدْتُ فِيْهَا وَأَمُّوْا مُسْتَحِيْهَا

حضرت نے پکار کر فرمایا کہ میرے سوا کسی اور کے پاس جاؤ کیونکہ مجھ کو اس خلافت کی پرواہ نہیں اور ان اشخاص کی طرف توجہ کرو جو اس کے دل سے طالب ہوں۔

اِنَّا لَمُسْتَقْبِلُوْا أَمْرَ مَصَاعِبِهَا
لَهَا وُجُوْهٌ تَغَشِّيْهَا طَوَارِيْهَا

ہمارے سامنے ایسا سخت مرحلہ ہے کہ جس کے شدائد طرح طرح کے پہلو رکھتے ہیں۔

اَفَاقُكُمْ قَدْ أَغَامَتْ وَهِيَ مُمْطِرَةٌ
بُرُوْقُهَا مَا اخْتَفٰى عَنِّيْ تَلْوِيْهَا

تمہارے افق پر سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں اور یہ برس کر رہیں گے، ان کی چمکتی ہوئی بجلیوں کا پیچ وخم مجھ پر مخفی نہیں ہے۔

وَقَدْ تَنَكَّرَتِ السبلِ الَّتِي وَضَحَتْ
تَنَكُّرًا يُوْرِثُ الْإِضْلَالَ وَالِيْهَا

واضح راستے ہدایت کے اس طرح اجنبی بن گئے ہیں کہ گمراہی اور سرگشتگی کا اندیشہ ہے۔

فَاِنْ اَجَبْتُ فَاِنِّيْ رَاكِبٌ بِكُمْ
طُرُقاً بِعِلْمِيْ يُجَا فِيْهَا مُجَافِيْهَا

اگر میں تمہاری خواہش کو قبول کروں تو یقینا تم کو اپنے علم کے مطابق ایسے راستوں پر چلاؤں گا جس سے پہلوتہی کرنے والے پہلوتہی کرتے ہیں۔

وَلَسْتُ أَصْغِيْ اِلٰى قَوْلٍ ومعبّة
مَادُمْتُ اَحْكَامَ رَبِّ الْعَرْشِ أُجْرِيْهَا

اور ہرگز میں کسی کے کہنے سننے یا ناراض ہونے کی پرواہ نہ کروں گا جب تک کہ خدائی احکام کا اجرا کرتا رہوں۔

وَاِنْ تَرَكْتُمْ عَلِيّاً مِنْ وِلَايَتِكُمْ
فَاِنَّنِيْ وَاحِدٌ مِنْ بَيْنِ اَهْلِيْهَا

اور اگر تم علیؑ کو اپنی حکومت سے معاف کردو تو میں معمولی افراد میں سے ایک شخص کی حیثیت سے بسر کر لے جاؤں گا۔

وَقَدْ اَكُوْنُ وَاَيْمُ اللهِ اَكْثَرُكُمْ
سَمْعاً وَطَوْعاً وَاِخْلَاصاً لِوَالِيْهَا

اور خدا کی قسم شاید میں تم سب سے زیادہ حاکم وقت کے احکام کی اطاعت وفرماں برداری کرنے والا ہوں گا۔

وَاَنْ اَكُوْنَ وَزِيْرًا فِيْ اِمَارَتِهٖ
خَيْرٌ لَكُمْ فَدَعُوْنِيْ مِنْ تَوَلِّيْهَا

میرا وزیر ہونا کسی دوسرے حاکم کے لئے تمہارے واسطے بہتر ہے لہٰذا مجھ کو حکومت کے قبول کرنے سے معاف کرو۔

قَالُوْ اَوَلَیسَ لَهَا اِلّاَ اَبُوْحَسَنٍ

یُجرِیٰ سَفِینَتَهَا أَمْنًا وَیُرسِیهَا

سب نے یک زبان ہوکر کہا کہ ابوالحسن (علیؑ) کے سوا کوئی اس ناؤ کو منجھدار سے نکال کر ساحل تک نہیں پہنچا سکتا۔

اِنّا نَنَا شِدُکَ اللّٰہَ الْمُهَیمِنَ أَنْ

تُعِیدَ لِلشِّرْعَةِ السَّمْحَا تلاَ لِیهَا

ہم آپ کو خدا کی قسم دیتے ہیں کہ آپ شریعت اسلامیہ کی چمک دمک کو از سر نو تازہ کردیں۔

وَأنْ تَمُدَّ یَداً بِیضًا لِأُ مَّتِنَا

بِهَا تَعُوْدُ اِلٰی مَاضِیٰ تَصَافِیهَا

اور اس طرح امت کی طرف نصرت کا ہاتھ بڑھا کر اس کے صاف اور خوشگوار ماضی کو دوبارہ پلٹا دیں۔

أ لَا تَرٰی الْمُلْکَ وَالْاِسلَامَ فِیْ خَطَرٍ

دَانٍ وَنَکْبَةٍ صَعْبٍ تلاَفِیهَا

کیا آپ مملکت اسلامیہ اور خود اسلام کو خطرہ میں نہیں دیکھتے اور وہ ایسی مصیبت میں مبتلا ہے جس کی تلافی بہت مشکل ہے۔

أَ لَا تَخَافُ اِلٰهاً أَنْتَ تَعْبُدُهُ

فِیْ اُمَّةٍ بِکَ قَدْ نَاطَتْ أَمَانِیهَا

کیا آپ کو اپنے معبود حقیقی کا خوف نہیں ہے اس پوری امت کے بارے میں کہ جو آپ سے لو لگائے ہوئے ہے۔

وَلَمْ یَزَالُوْ بِهِ حَتّٰی اَصَاخَ لَهُمْ

سَمْعًا وَدَعْوَتَهُمْ اَمسٰی مُلَبِّیهَا

اور وہ لوگ یونہی اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت نے ان کی تمنا پر توجہ فرمائی اور ان کی خواہشوں کو قبول کیا۔

حَتّٰی عَلٰی فَضْلِهِ اَثْنَتْ وَصَاحَ

اَمِیْرُ الْمُؤمِنِینَ عَمِیدُ الْعَرَبِ مُثْنِیهَا

یہاں تک کہ سب نے حضرت کی مدح وثنا کرنا شروع کی اور آواز دی کہ اے امیر المومنینؑ اے سردار عرب۔

اُمْدُدْ یَمِیْنَکَ فَضْلاً کَیْ نُبَایِعَهَا

وَاظْفَرْ بِبَیْعَةِ اِخْلَاصٍ نُوَدِّیهَا

اپنا ہاتھ پھیلائیے کہ ہم سب بیعت کریں اور آپ ہماری مخلصانہ بیعت کو قبول فرمائیں۔

فَقَالَ فِیْ عُقْرِ دَارِیْ لَسْتُ اَقْبَلُ

مِنْکُمْ بَیْعَةً خُفْیَةً یَا مُسْتَبِیْعِیهَا

حضرت نے فرمایا کہ اے بیعت کے طالب لوگوں میں اپنے گھر کے اندر مخفی حیثیت سے بیعت حاصل کرنے کو کسی طرح منظور نہیں کرسکتا۔

وَاِنَّمَا الْمَسْجِدُ الْمَبْرُوْرُ مَوْضِعُهَا

وَالنَّاسُ تَشْهَدُ عَاطِیهَا وَمُعْطِیهَا

بے شک مسجد نبی میں کہ جو مبارک ومقدس مقام ہے جس موقع پر کہ تمام لوگ حکومت کے لینے والے اور دینے والے کا مشاہدہ کریں۔

فَاَسْرَعُوْا بِالْعَلِیِّ الْمُرْتَضٰی وَأَهَا

زِیجُ السُّرُوْرِ یُغَنِّیهَا مُغَنِّیهَا

علی بن ابی طالبؑ کے ساتھ تیزی کے ساتھ سب کے سب فرحت وسرور کے گیت گاتے ہوئے روانہ ہوئے۔

وَالنَّاسُ مِنْ حَوْلِهٖ تُبْدِیْ بَشَائِرَهَا

مِنْ بَعْدِ اَنْ بَلَغَتْ فِیْهِ تَمَنِّیْهَا

لوگ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے اپنی خوشی کے جذبات کوظاہر کررہے تھے چونکہ ان کی آرزو حضرت کے متعلق برآئی تھی۔

حَتّٰی اِذَا مَا انْتَهَتْ لِلْمَسْجِدِ النَّبَوِ

یِّ بَایَعَتْهُ وَمَاضَنَّتْ بِاَیْدِیْهَا

یہاں تک کہ مسجد نبوی میں پہنچ گئے تو سب نے حضرت کی بیعت کی اور کسی نے ہاتھ بڑھانے میں بخل نہیں کیا۔

وَهٰكَذَا صَارَ مَوْلَانَا الْعَلِیُّ

اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَسَادَ الْعَرَبِیَّ حَامِیْهَا

اوراس صورت سے ہمارا بلند مرتبہ امامؑ تمام مومنین کا امیر قرار پایا اورعرب کی سرداری ان کے سچے حمایت کرنے والے کوحاصل ہوئی۔

وَسَرَّتِ الْخَلْقُ مِنْ عَرَبٍ وَمِنْ عَجَمٍ

بِهٖ وَفَاضَتْ عَلَی الدُّنْیَاتَهَا نِیْهَا

تمام خلق خداعرب وعجم کواس سے مسرت ہوئی اوردنیا میں خوشی وتہنیت کاوفور ہوگیا۔

خلافت الٰہیہ اورسیاست ملوکیہ میں تفرقہ

حقیقی جانشین رسولؐ کے روحانی خصوصیات

خدا کا رسولؐ دنیا میں کسی عظیم الشان سلطنت کی بنیاد قائم کرنے نہیں آیا تھا، نہ وہ ایسے شاندار قصروں کی تعمیر کرنا چاہتا تھا جن کے کنگرے سطح فلک سے مقابلہ کرتے ہوں، نہ وہ کوئی خزانہ جمع کرنے کی ضرورت سمجھتا تھا جس میں تمام اطراف ارض کا خراج سمیٹ کر ذخیرہ کیا جائے، نہ وہ ایسا شاندار لباس پہننا باعث افتخار سمجھتا تھا جس کی چمک دمک سے دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہوں، بے شک اگر پروردگار عالم کی نظر میں ان ظاہری اشیاء کے لئے کوئی اہمیت حاصل ہوتی تو قیصروکسریٰ سب سے زیادہ حقدار تھے کہ ان پر وہ اپنا پیغام نازل کرتا، ملک عرب کے بڑے بڑے سرمایہ پرست کافی وجوہ رکھتے تھے کہ وہ ان کو اپنا سفیر مقرر کرے لیکن یہ کیا تھا کہ اس نے بنی ہاشم کے گھرانے میں سے ابوطالبؑ کے پروردہ یتیم کورسالت کے عہدہ کے لئے منتخب کیا اورنبوت کا اعلیٰ منصب اس کے متعلق کیا۔ تمام سرمایہ داران قریش اور ارباب حشم وخدم کی گردنیں اس ہستی کے سامنے خم کرادیں کیا اس لئے کہ ان کے اقتدار سے مافوق ایک دنیاوی سلطنت قائم کرنا منظور تھا؟ ہرگز نہیں، اگر ایسا ہوتا تو وہ قادر تھا اپنے پیغمبر کے لئے مکہ ومدینہ کے پہاڑوں کوطلاے خالص بنادیتا اور زمین کے سنگریزے زروجواہر بن جاتے لیکن اس کے برخلاف رسولؐ نے اپنی زندگی بھر دونوں وقت شکم سیر ہوکر کھانا بھی نہ کھایا، شاہی محل اور سلطانی قصر کیسے! رسالتمآبؐ کے گھروں کی تو یہ شان تھی کہ حسن بصری ناقل ہیں کہ میں بچپنے میں رسولؐ کے گھروں کے اندر جایا کرتا تھا تو چھت کو اپنے ہاتھ سے چھولیتا تھا (وفاءالوفاء) مسجد کا شاہی دربار جس میں ارکان دولت کا اجتماع ہوتا تھا اس میں سلطان دین ودنیا کے پاس بیٹھنے والے وہ اشخاص ہوتے تھے جن کے پاس پہننے کو

سابوت کپڑا بھی نہ تھا۔ اس سیرت کو دیکھتے ہوئے یہ بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں رہتی کہ خدا کا رسول ملوکانہ زندگی بسر کرنے کے لئے نہیں بلکہ بنی نوع بشر کو حقائق توحید سے مطلع کرنے اور دنیا کو درس اخلاق دینے کے لئے آیا تھا، وہ مادہ کی ظاہری شان وشوکت کو توڑ کر روحانیت کے جذبہ کو ترقی دینا اپنا فرض سمجھتا تھا اور اول دور بعثت سے لے کر آخری وقت تک اس کا نصب العین یہی رہا۔

رسولؐ کی آنکھ بند ہوئی اور موت نے ان کے ظاہری فیوض کو مسلمانوں سے سلب کیا جس کے ساتھ ہی اخلاق وعادات، جذبات واخلاق میں عجیب وغریب انقلابات پیدا ہوگئے، روحانیت کی جگہ مادیت نے لینا شروع کی اور حقائق پرستی کے بجائے سرمایہ پرستی نے اپنا عمل قائم کر دیا قیصر وکسریٰ کے ممالک فتح ہوئے، ایران کی نازک مزاجی، ظاہرداری فضول خرچی کا اثر غیر متمدن عربوں نے لیا اور مال غنیمت کی کثرت نے خزانوں کے دامن کو زروجواہر سے مملو کر دیا۔ اب کیا تھا، بیدردی سے اسلام کی دولت صرف کی جانے لگی اور اسلامی خصوصیات کے برخلاف ملوکیت اور جہانگیریت کا دور دورہ شروع ہوگیا، مستحقین کے بجائے مسلمانوں کا مال ملکی سیاست اور ذاتی اغراض کا ذریعہ قرار پا گیا۔

''سیاست'' اپنے حقیقی معنی میں بہت خوشگوار اور قابل وقعت لفظ ہے، یہ درحقیقت اس انتظامی قابلیت کا نام ہے جو مبداءِ فیض کی طرف سے مدنیت واجتماع کی حفاظت کے لئے کسی انسان میں ودیعت کی جاتی ہے اور جس کے آثار اصلاح ملک وملت کے ضمن میں ظاہر ہوتے ہیں۔

لیکن افسوس ہے کہ جس طرح بہت سی لفظیں اپنے غلط استعمال کی وجہ سے بے وقعت ہوگئی ہیں اسی طرح سیاست کا لفظ اپنے بے محل موارد استعمال کی بدولت اصلی مفہوم سے ہٹ کر دوسرے معنی کا قالب بن گیا ہے، سیاست کے معنی جدید اصطلاح میں اپنے مقصد کو حق ناحق ہر طریقہ سے کامیاب بنانا اور اس کے حصول میں جن طریقوں کی بھی ضرورت ہو ان کا بلند حوصلگی کے ساتھ استعمال کر کے اس مقصود کو حاصل کر لینا۔

خدائی مدرسۂ اخلاق وتمدن کے تعلیم یافتہ افراد میں سیاست کی جنبہ کو مذکورۂ بالا حیثیت سے تلاش کرنا کھلی ہوئی غلطی ہے، نہ یہ کہ وہ سیاست کے پیچیدہ رموز واسرار سے ناواقف ہوا کرتے ہیں، ہرگز نہیں بلکہ اس لئے کہ ان کو دیانت وامانت کے فرائض اور خدائی قانون کی دفعات اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان طریقوں کا استعمال کریں، وہ تو قدم قدم پر اپنے خدا کی مرضی کے جویا اور اس کی خوشنودی کے طالب ہوا کرتے ہیں اور اپنی حرکت وسکون بلکہ گردش چشم اور جنبش زبان میں اس بات پر نظر رکھتے ہیں کہ اس قانون کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے جس کے وہ پابند بنا دیئے گئے ہیں، اس فلسفہ کو حکیم الاسلام امیر المومنینؑ نے چند کلموں میں اس طرح ادا فرمایا ہے: واللّٰہ لَوْ لَا الدِّیْنُ لَکُنْتُ اَدْھی الْعَرَب۔ دنیا پرست افراد اپنے مقصد کے حصول میں ہر جائز وناجائز طریقہ کا عمل میں لانا ضروری سمجھیں لیکن شریعت الٰہیہ کے محافظ اور دینی احکام کے نگہبان افراد کسی طرح ان طریقوں کو اختیار نہیں کر سکتے جن

کے متعلق مذہبی احکام اجازت نہیں دیتے اگر سیاست سے ناواقفیت اسی کا نام ہے تو ہم بہت کشادہ پیشانی کے ساتھ اس کے تسلیم کرنے کے لئے موجود ہیں۔ دنیاوی بادشاہوں، مادہ پرست ارباب اقتدار میں اگر تم سیاست کے اس مفہوم کو تلاش کرتے ہو تو کچھ بیجا نہیں، مگر خلافت الٰہیہ کے مالک اور شریعت مقدسہ کے محافظ افراد کے حالات زندگی اور طرز عمل میں اس مفہوم کی جستجو کرنا دانشمندی سے بہت بعید ہے۔

وصی درحقیقت نبی کا جانشین ہوا کرتا ہے لیکن جانشینی سے مراد صرف ظاہری مسند پر بیٹھ جانا یا منبر پر رسولؐ کی جگہ کو پر کر دینا نہیں ہے بلکہ اعمال واخلاق اور سیرت میں بالکل رسولؐ کی تصویر ہو کر دنیا کے سامنے نمونہ رسولؐ بن کر ظاہر ہونا ہے جس کی وجہ سے رسولؐ کی جگہ پر ہو جائے بایں معنی کہ اخلاق وکمالات کی حیثیت سے وصی اس طرح نور رسالت کا آئینہ بن جائے کہ گویا دنیا کو معلوم نہ ہو کہ رسول عالم میں موجود نہیں ہیں، یہ حقیقی معنی جانشینی کے ہیں اور جس میں یہ صفت پائی جائے وہی حقیقی جانشین رسول کہے جانے کا مستحق ہے۔

رسالت مآبؐ کی وفات کے بعد جو انقلابات پیدا ہوئے انھوں نے شریعت اسلامیہ کی صورت کو بہت کچھ بدل دیا تھا اور روحانیت کے بجائے مادیت نے پورے طور پر اپنا عمل قائم کر لیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ارباب اقتدار کی طرف سے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے اسلامی روپیہ عالی حوصلگی کے ساتھ صرف کیا جانے لگا مخصوص حوالی موالی اور رشتہ داروں کا خیال تمام مسلمانوں سے مقدم رکھتے ہوئے اہل اسلام کے مشترکہ اموال کو معدودے چند افراد سے مخصوص کر دیا گیا۔ عثمان کا دوران خصوصیات کی حیثیت سے پورا امتیاز رکھتا ہے۔

مصر، عراق، شام تمام اطراف خاندان بنی امیہ کے تسلط واقتدار کا مرکز بن گئے، مروان بن الحکم جو رسولؐ کی زندگی میں بلکہ اس کے بعد بھی خلیفہ اول وخلیفہ ثانی کے عہد تک مدینہ کے اندر داخل ہونے سے ممنوع تھا وہ ذاتی مصالح کی بناء پر اتنا سر چڑھایا گیا کہ خلافت اسلامیہ کا نظم ونسق اس کی چشم ابرو کے اشارے کا تابع ہو گیا، آرمینیا کا ملک فتح ہوتا ہے اور اس کا پورا خمس مروان کو ہبہ کر دیا جاتا ہے عبداللہ بن خالد بن امیہ تنگدستی کا اظہار کرتا ہے اس کو ۴؍لاکھ درہم بیت المال سے سپرد کر دیئے جاتے ہیں، حکم بن ابی العاص جس کی گردن میں رسولؐ کی زبان سے لعنت کا طوق پڑ چکا تھا وہ مدینہ میں لا کر مقربین بارگاہ میں داخل کیا گیا اور اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ حقوق مسلمین سے ایک لاکھ درہم بھی اس کو عطا کر دیئے گئے، مروان کے بھائی حارث بن حکم کو ''تہرز'' نامی ایک موضع لکھ دیا گیا حالانکہ رسالت مآبؐ اپنی زندگی میں اس کو مسلمانوں کے لئے تصدق قرار دے چکے تھے، خود مروان بن الحکم کے نام فدک لکھ دیا گیا حالانکہ یہی وہ باغ ہے جس کے لئے فاطمہ زہرا علیہا السلام نے پہلے دور میں کبھی میراث کی بنا پر کبھی عطیۂ رسولؐ ہونے کی رو سے احتجاج کیا مگر ان کے قول کو رد کیا گیا اور اس کو مسلمانوں کے لئے وقف بتایا گیا، لیکن تیسرے دور میں حکم بدل گیا اور اسے مروان بن الحکم طرید رسول کی ملکیت قرار دینا جائز سمجھا گیا، مدینہ کے ارد گرد جتنی سرسبز وشاداب زمینیں

تھیں وہ سب حکومت کی طرف سے اپنے لئے مخصوص قرار دے دی گئیں اور سوائے بنی امیہ کے کسی شخص کو مسلمانوں میں سے وہاں مویشی لے جا کر چرانے کی اجازت نہیں رہی، افریقہ غربی (طرابلس الغرب سے لے کر طنجہ تک) فتح ہوا اور جتنا بھی مال خراج وہاں سے آیا وہ سب بلاشرکت غیرے عبداللہ بن ابی سرح کو عطا کر دیا گیا، معاویہ کے والد ابوسفیان بن حرب کو بیت المال سے دو لاکھ روپئے دیئے گئے اور یہ اسی دن کا تذکرہ ہے کہ جب مروان کو ایک لاکھ درہم ملے تھے جس پر زید بن ارقم خازن بیت المال نے کنجیاں لاکر سامنے رکھ دیں اور رونا شروع کیا، عثمان نے کہا کہ تم اس لئے روتے ہو کہ میں نے اپنے قرابت داروں کی اعانت کی، زید نے کہا ایسا نہیں بلکہ میں اس خیال سے رویا کہ آپ نے مسلمانوں کا مال غیر مستحق اشخاص کے سپرد کر دیا، اگر مروان کو سو درہم بھی دیئے جاتے تو بہت تھے اور ابوسفیان کو ایک درہم بھی ملتا تو زیادہ تھا کیونکہ یہ دونوں ہمیشہ سے اسلام کے ساتھ جنگ کرتے رہے، عوض اس کے ان کلمات سے کچھ اثر لیا جاتا جواب ملا کہ اچھا کنجیاں رکھ دو ہم کو بیت المال کی خزینہ داری کے لئے کوئی دوسرا شخص مل جائے گا۔ اس کے علاوہ ابوموسیٰ اشعری نے عراق سے اموال خراج کو بھیجا وہ تمام بنی امیہ کے درمیان تقسیم کر دیا گیا اس قسم کے واقعات ہیں جن کو اگر تفصیل سے بیان کیا جائے تو ایک طویل مضمون درکار ہے۔

بنی امیہ کے ساتھ ان تمام رعایتوں کا منشاء صرف سیاسی مصالح تھے اور یہ غرض تھی کہ بنی ہاشم کے مقابلہ میں اس گروہ کو پوری طاقت حاصل رہے اور دامن خلافت تک کوئی آنچ آنے لگے تو یہ لوگ سینہ سپر ہوں شام میں معاویہ اور ان کے جانشین سلاطین نے طلا ونقرہ کی سیاسی بارش کو بہت ترقی دی، ان کا نقطۂ نظر ذرا وسیع تھا، وہ صرف بنی امیہ کے جذب قلوب پر اکتفا نہ کرتے ہوئے تمام اشراف قبائل اور رؤسائے قریش کی رضامندی کو حاصل کرنا چاہتے تھے اور اکثر وہ اپنے طلائی اور نقرئی سکون سے اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہو جاتے تھے، اگر ذرا غور سے ان تمام سلاطین کے حالات زندگی میں غور کیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی غرض سوائے اپنے ذاتی مصالح اور سیاسی اغراض کی اور کچھ نہ تھی اور اپنے مقصد کے حصول میں کسی مذہبی یا اخلاقی قانون کا لحاظ ضروری نہ سمجھتے تھے، یہی ملوکانہ سیاست اور دنیاوی طریق حکومت ہے جس سے اسلام کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

اس سب کے مقابلہ میں جب امیرالمومنینؑ کے طرز حکومت اور حالات زندگی پر نظر کی جائے تو بے ساختہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آپ کا اقتدار زروجواہر کی بارش کا رہین منت اور سیاسی طریق عمل کا زیر بار احسان نہیں ہے، آپ اپنے پیش رو حضرت رسول اکرمؐ کی طرح خالص روحانی سلطنت کی بنیاد قائم کرنا چاہتے تھے جس میں تصنع اور ریاکاری، جنبہ داری کا نشان تک نہیں پایا جا سکتا، مسلمانوں کے بیت المال کو حضرت ایک امانت سمجھتے تھے جو خالق کریم کی طرف سے آپ کے ہاتھ میں مستحقین تک پہنچانے کے لئے ودیعت رکھی گئی ہے، کیا ممکن ہے کہ اس میں سے ایک حبہ بھی بلا استحقاق کسی کو

دے دیا جائے ایک طرف شام میں قبیلۂ قریش کے بڑے بڑے افراد کے لئے خزانوں کے منھ کھلے ہوئے تھے اور جو شخص بنی ہاشم سے منحرف ہوکر حاکم شام کا دوست ہو جائے وہ مال دنیا سے مالا مال ہو جاتا تھا لیکن دوسری طرف قرآن مجید کی تعلیم کا خیال اور سنت رسولؐ کی پابندی پیش نظر تھی، تمام مسلمانوں میں مساوات جو شریعت اسلامیہ کا طرۂ امتیاز ہے اور جس کو کتاب خدا نے اِنَّما الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کہہ کر واضح کیا تھا، اس سے امیر المومنینؑ ذرہ برابر ہٹنا نہ چاہتے تھے، یہاں تک کہ اس مساوات سے حضرت کی اولاد، بھائی، بھتیجے اور دیگر عزیز قریب بھی مستثنیٰ نہ تھے، عقیل جو حضرت کے حقیقی بھائی تھے انھوں نے کتنا چاہا کہ ان کے مقررہ وظیفہ میں کچھ اضافہ کر دیا جائے مگر کسی طرح امیر المومنینؑ نے منظور نہ کیا، سابق دور میں قرابت داروں اور قوم قبیلہ والوں کے ساتھ مخصوص رعایتیں عقیل کو ہمت دلا رہی تھیں کہ وہ بھی اپنے بھائی سے اس قسم کی رعایتوں کے خواستگار ہوں لیکن علی بن ابی طالبؑ کی طرف سے یہی جواب ملتا تھا کہ بیت المال تمام مسلمانوں کا حق ہے مجھ سے مخصوص نہیں ہاں میں بھی دوسرے مسلمانوں کے برابر لینے کا مستحق ہوں، اگر تم کہو تو میں اپنے حصہ میں سے تم کو دے دوں، عقیل کا اصرار زیادہ ہوا، حضرت نے فرمایا کہ جمعہ کو مسجد میں نماز کے وقت مجھ سے ملاقات کرو، روز جمعہ جب مسجد نمازگزاروں سے مملو ہو گئی اور حضرت نماز وخطبہ سے فارغ ہوئے تو عقیل کو اپنے پاس بلا کر ارشاد فرمایا، کیوں تمہارے نزدیک جو شخص ان سب لوگوں کی خیانت کرے وہ کیسا ہے؟ عقیل نے کہا کہ اس سے بدتر کوئی شخص نہیں، امیر المومنینؑ نے ہنس کر فرمایا ''تم مجھ سے یہی تو چاہتے ہو کہ میں ان سب کی خیانت کروں اور تم کو تمام لوگوں کے حقوق میں سے مخصوص امتیاز دے دوں۔''

کچھ روز پھر سکوت کرنے کے بعد عقیل نے اپنی خواہش کا اعادہ کیا اور اب مرتبہ اولاد کو لے کر حضرت کی خدمت میں آئے جن کے چہروں سے فقروفاقہ کے آثار نمایاں تھے، حضرت نے پھر اپنے حصہ کو جو بیت المال سے مقرر تھا دینے پر آمادگی ظاہر فرمائی۔ اور جب انھوں نے اسے منظور نہ کیا تو حضرت نے فرمایا کہ شام کو میرے پاس آنا، جب وہ وقت آیا عقیل حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے ایک ٹکڑا لوہے کا جو آگ سے گرم کیا ہوا رکھا تھا ان کے ہاتھ پر رکھا، عقیل فریاد کرنے لگے کہ آپ مجھ کو آگ سے کیوں اذیت دیتے ہیں؟ حضرت نے مسکرا کر فرمایا کہ تم ایک لوہے کے ٹکڑے سے جو دنیا کی معمولی آگ سے گرم کیا گیا ہے اتنا گھبراتے ہو اور مجھ کو چاہتے ہو ایسی آگ میں بھیجو جسے خدا نے اپنے قہر وغضب سے روشن کیا ہے۔

کوتاہ نظر اور ظاہر بین افراد امیر المومنینؑ کے اس طرز عمل کو چاہے سیاست اور اصول حکومت کے خلاف تصور کریں لیکن اگر عقل وانصاف کی روشنی میں دیکھا جائے تو علی بن ابی طالبؑ کا طرز عمل اسلامی اصول مساوات کا بہترین نمونہ ہے۔

کیا امیر المومنینؑ سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ بھی مثل سابق دور کے تمام بیت المال کو اپنے اعزّہ واقارب سے مخصوص کر دیتے اور تمام مسلمان اس سے محروم کر دیئے

جاتے، علی بن ابی طالبؑ اپنی خلافت میں ملوکانہ سیاست کے استعمال کے محتاج نہ تھے، ان کی خلافت خلافت الٰہیہ تھی اور روحانی طاقت وقوت پر اس کا دارومدار تھا۔

عالم انسانیت کا معلم اعظم

آفتاب لاکھوں بار زمین کے گرد گردش کرے یا زمین کروروں مرتبہ آفتاب کے گرد چکر لگائے، لیل ونہار کے سیاہ وسفید ورق اپنے تمام دلاویز نقوش کے ساتھ سامنے آئیں اور گذر جائیں اور افراد انسانی کے لئے اپنا وجود صحیفۂ تاریخ میں محفوظ کر جائیں، انسانی نسل کے قافلے اس منزل میں اتریں، رہیں سہیں اور سفری ہو جائیں لیکن ''انسان کامل'' یا عالم انسانیت کے معلم اعظم کی تلاش تم کو ہمیشہ ایک محدود ہی دائرہ کی طرف رہنمائی کرے گی جس میں وسعت کا پتہ اور کثرتِ تعداد کا نشان نہیں۔

ہر قوم اپنے لئے گنتی کے افراد رکھتی ہے جنکو وہ اپنے کامل ترین افراد کی فہرست میں پیش کر سکتی ہے اور ان میں بھی جب انتخاب کیا جائے تو سب سے زیادہ کامل تر ہستی ایک ہی ہوگی جو اس خط ارتقاء کا انتہائی نقطہ سمجھی جا سکتی ہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ اقوام عالم میں باعتبار اپنی صداقت، روحانیت اور خصوصیات روحانی کے سب سے زیادہ مکمل قوم اسلام کی قوم ہے تو یہ بھی تسلیم کرنا ضروری ہوگا کہ اس قوم کی ''کامل ترین'' یا سب سے بڑی ہستی وہی ہونا چاہئے جو تمام ''عالم انسانیت'' میں یکساں طور پر ''معلم اعظم'' سمجھی جا سکے۔

دنیا مادہ پسند ہے اور مادی اشیاء پر جان دیتی ہے، مسلمانوں کے عام افراد بھی اپنے بشری افتاد طبع کی بناء پر اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھے، انھوں نے عظمت کا معیار ظاہری شان وشوکت، اکثریت، انتظامی معاملات میں ظاہری سوجھ بوجھ اور بست وکشاد، نظم ونسق کی قابلیت کو سمجھ لیا اور اسی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے لگے لیکن اگر خود اسلام ایک عملی قانون ہے، اگر اس نے اقوال سے زیادہ اعمال کو اہمیت دی ہے۔ اگر وہ اپنے ماننے والوں کی ترقی روحانی اور تہذیب نفسانی اور اخلاقی شائستگی کا ذمہ دار ہے تو اس کی مکمل ترین ہستی وہی ہو سکتی ہے جو ان تعلیمات کا مکمل نمونہ اور عملی مجسمہ ہو جس نے اپنے افعال واعمال اور زندگی کے ہر حرکت وسکون سے دنیا کے لئے ایسے نمونے پیش کئے ہوں جن کی موافقت شائستگی اخلاق اور تہذیب نفس، جامعۂ بشری کی شیرازہ بندی اور امن وامان، زندگانی ملّی کے خوشگوار وکامیاب بنانے کی ضامن ہو، یہی ہستی وہ ہو سکتی ہے جو دنیائے اسلام کے ''انسان کامل'' یا ''عالم انسانیت کے معلم اعظم'' کا لقب پانے کی مستحق ہو۔

رسول اسلامؐ نے اپنے تعلیمات کی ایک روح تھی کہ جو پھونکی اور ظرف واستعداد کے مطابق ہر ایک نے اس روح سے اثر لیا اور جاہلیت کی موت سے زندہ ہو کر نشاۃ ثانیہ حاصل کیا لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس روح کا مکمل اثر لے کہ خود اسی روح کا مجسمہ بن جانے والی کچھ ہی مخصوص ہستیاں سمجھی جا سکتی ہیں جن میں بھی تفرقہ وامتیاز کی بنا پر افضل واکمل ہستی ایک ہی ہوگی اور کوئی نہیں۔

بے شک افراد اسلام کی سیرت زندگی ہمارے سامنے ہے، تاریخ کے اوراق ان تمام حوادث وواقعات کو اپنے نقوش والفاظ کی طلسم سے محفوظ کئے ہوئے ہیں جو خود ہماری آنکھوں کے سامنے نہ ہوئے تھے اور افسانہ ماضی بن چکے ہیں۔

ان میں بعض تو ایسے تاریک مرقع ہیں کہ جن کی طرف دیکھ کر خود بخود آنکھ بند ہوجاتی ہے اور منھ پھر جاتا ہے۔ بعض ایسے ناقص اور غیر مکمل مجسمے سامنے آتے ہیں جن میں محاسن کے ساتھ عیوب ونقائص کی شرکت سے خط وخال بگڑا ہوا نظر آتا ہے اور نمونہ عمل بننے کے قابل نہیں۔ بعض اتنے مدھم نقوش ہیں کہ جو صاف نظر نہیں آتے اور جن میں کفر واسلام کا امتیاز مشکل ہوتا ہے۔

حجاج بن یوسف ثقفی، عبدالملک بن مروان، ولید، یزید بن معاویہ، معتصم، منصور متوکل وغیرہ ایسے وہ افراد کہ جنھیں عام ذہنیتوں نے اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ کے ساتھ اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ کا مصداق قرار دے کر مسلمانوں کا قبلۂ اطاعت اور کعبۂ توجہ بتلایا ہے کیا یہی ایسے نمونے ہیں جن کو عالم کے سامنے پیش کرکے ہم اسلام کی روحانیت اخلاقیت صداقت وحقانیت کے سامنے ان کو سر تسلیم خم کرنے کی دعوت دیں اور ان ہی کے طرز عمل یعنی سفاکی، خونریزی، امن واطمینان کے ساتھ دشمنی یا عیاشی، شہوت رانی، خواہش پرستی یا خودغرضی، نفسانیت، جانبداری کو نمونے میں پیش کرکے یہ دعویٰ کریں کہ اسلام دنیا میں شائستہ اخلاق اور بلند تعلیمات کا حامل وعلمبردار اور انسانی ترقی وتہذیب کا ذمہ دار بن کر آیا ہے۔

یا اس سے آگے بڑھ کر شاہانہ شان وشوکت اور ملوکانہ حشم وخدم، سیاسی جوڑتوڑ، مکاری، چال بازی یا اپنے مفاد کے لئے قوم ومذہب کے مفاد کو پامال کردینے کی تعلیم کو ناز وافتخار اور مسرت کے ساتھ پیش کرکے اسلام کی روحانیت اور عملی تربیت کے کوس لمن الملکی بجانے کی جرأت کریں یا اور آگے جاکر حریت ومساوات کی بے قدری، اخوت اسلامی کی بے احترامی، قبیلہ بندی اور اپنے قوم وقبیلہ بھائی بندوں کے ساتھ جانبداری آزادی رائے کو سلب کرنے کے ساتھ جبر وتشدد کی کارفرمائی، حق گویوں کی زبان بندی اور ان کی دل آزاری معاہدات کی خلاف ورزی اور جمہور کے جذبات کی پامالی یہ ہے جو اسلامی تعلیمات کے نمونے میں پیش کی جائے؟

یا اسلام کی روحانیت وصداقت کی بہترین سند اور اسلام کی تعلیم اخلاقی وتہذیب اجتماعی کی مکمل دستاویز انہیں فتوحات کو قرار دے لیا جائے جن میں اسلام کی تلوار جارحانہ صورت سے دنیا کے امن وامان کو خاک میں ملا رہی تھی اور آس پاس کے ہمسایہ اقوام کو تباہ کرکے اپنی سلطنت اور حدود مملکت میں اضافہ کررہی تھی اور جس نے ہمیشہ کے لئے اسلام کے پاک دامن پر یہ دھبہ لگا دیا کہ وہ امن وامان کا دشمن ہے۔ اور یہ کہ وہ تلوار کے زور سے پھیلا ہے؟ یا اس علم دوستی وادب پروری کو اسلامی تعلیمات کا نمونہ سمجھا جائے۔ جو کتب خانہ ''اسکندریہ کے تباہ ہونے کی صورت میں ظاہر ہوئی'' جس کی وجہ سے علم دوست اقوام یہ کہنے لگے کہ ''اسلام علم کا دشمن ہے۔''

یا اسلام کی سچائی اور روحانیت کا ثبوت ذاتی نفوذ واقتدار جاہ طلبی اور شخصیت پروری حقداروں کے حقوق سے چشم پوشی اور حق طلبی کے خلاف جبر وتشدد، تخویف وتہدید، ظلم واستبداد، ناانصافی اور غیر رواداری وغیرہ ایسے اوصاف کو سمجھائے جن کے واقعات تاریخ اسلامی میں صاف طور سے محفوظ ہیں۔ آخر پھر کوئی بتائے کہ غیر اسلامی دنیا کے سامنے ہم اسلامی تعلیمات کے عملی نتیجہ کی کس طرح روشناسی کرائیں اور کس طرح ہم ثابت کریں کہ اسلام عملی مذہب ہے اور ایسے افراد ہیں جنھوں نے اس کے تعلیمات پر اس طرح عمل کیا کہ وہ اس کی مجسم مثال بن گئے۔

بے شک اس کے لئے دنیائے اسلام میں چند ہی ہستیاں ہیں جن کے عملی اوصاف محامد وخصال اور اخلاق وعادات کا آئینہ اتنا صاف اور بے عیب ہے جس میں کوئی دھبہ نظر نہیں آتا۔ اور ان میں ممتاز ونمایاں ہستی رسول اسلامؐ کے حقیقی جانشین اور ملت اسلامیہ کے واحد رہنما حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ کی ہے۔

ضرورت ہے کہ دنیا آپ کی سیرت زندگی، اوصاف وکمالات اور افعال واعمال کو دیکھے سمجھے اور غور کرے، ان کے عظیم نکات واسرار تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ اور دنیا کے سامنے پیش کرے۔ بے شک علیؑ ہی کی ہستی وہ ہے جس کا اتباع ملت اسلامیہ کے ارتقاء روحانی اور تہذیب وشائستگی اور تنظیم ملی کا ذمہ دار ہے اور یہی ہستی وہ ہے جس کو دنیا کے سامنے پیش کرکے یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ یہ ہے ''دنیا کا انسان کامل'' اور یہ ہے عالم انسان کا ''معلم اعظم''۔

مدح علی علیہ السلام

الحاج ڈاکٹر سید رضا حسین رمزؔ
سفینہ اپارٹمنٹ، نیپیر روڈ لکھنؤ

علیؑ مولا بنائے جارہے ہیں
کرم کے ابر چھائے جا رہے ہیں
نبیؐ ان کو اٹھائے جارہے ہیں
علیؑ عالم پہ چھائے جارہے ہیں
سنی احمدؐ نے جو باتیں خدا سے
وہی خُم میں بتائے جارہے ہیں
زمانہ جگمگاتا جارہا ہے
علیؑ بس مسکرائے جارہے ہیں
غدیر خم کے ایمانی نظارے
نگاہوں میں سمائے جارہے ہیں
بہشتی خلد میں جاتے ہیں جس سوٗ
علیؑ کے گیت گائے جارہے ہیں
ہماری شومئ قسمت یہی ہے
کہ ہم قرآں بھُلائے جارہے ہیں
وہ ہیں صرفِ کرم لمحہ بہ لمحہ
مرادیں تب ہی پائے جارہے ہیں
رضاؔ سچ مچ یہی ہے رمزؔ ہستی
انھیں دل کی سنائے جارہے ہیں